ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1953

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: علوم القرآن (1) (1953) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص قرآن و تفسیر)

سمسٹر: خزاں 2026

اکتسابی مشق نمبر 2 (یونٹ نمبر: 6 تا 9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(برائے مطالعہ و حوالہ)

نوٹ: یہ رہنما صرف مطالعے اور حوالے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو پابند کیا جاتا ہے کہ متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کریں اور جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1 (20 نمبر)

اسبابِ نزول کے بارے میں شاہ ولی اللہ کا نقطۂ نظر بیان کریں۔

تعارف

اسباب نزول علوم القرآن کے اہم ترین شعبوں میں سے ہے، کیونکہ کسی آیت کے نزول کا پس منظر معلوم ہونے سے اس کا مفہوم، اس کے حکم کی حکمت اور اس کے خطاب کا رخ متعین ہو جاتا ہے۔ تاہم اس فن میں ایک علمی مسئلہ ہمیشہ زیر بحث رہا ہے کہ اسباب نزول کی روایات کی حیثیت کیا ہے اور کس حد تک ہر آیت کے لیے کوئی واقعہ تلاش کرنا ضروری ہے۔ اسی سوال پر برصغیر کے عظیم محدث و مفسر شاہ ولی اللہ

دہلوی رحمہ اللہ (1703ء تا 1762ء) نے اپنی شاہکار کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں ایک متوازن اور منفرد نقطۂ نظر پیش کیا ہے جس کا بیان اس جواب کا موضوع ہے۔

شاہ ولی اللہ کا نقطۂ نظر اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے اسباب نزول کی اہمیت کا انکار کیے بغیر ان روایات کے بے تحاشا استعمال اور ہر آیت کے لیے من گھڑت قصے جوڑنے کے رجحان کی اصلاح کی۔ ان کی بحث نے بعد کے اہل علم، بالخصوص اردو تفسیر و ترجمے کی روایت کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ ذیل میں پہلے اسباب نزول کی عمومی حیثیت بیان کی جائے گی، پھر شاہ صاحب کی تقسیم، پھر ان کے اصول اور آخر میں مثالیں و اثرات پیش کیے جائیں گے۔

اسباب نزول کی تعریف اور عمومی موقف

سبب نزول سے مراد وہ واقعہ، سوال یا کیفیت ہے جس کے موقع پر یا جس کے جواب میں کوئی آیت یا آیات نازل ہوئی ہوں۔ عام علماء و مفسرین کا مسلک یہ رہا ہے کہ سبب نزول کی معرفت تفسیر کے لیے نہایت اہم ہے؛ امام واحدی فرماتے ہیں کہ جس آیت کا سبب نزول معلوم نہ ہو اس کی تفسیر کی طرف قدم بڑھانا مناسب نہیں، اور ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ سبب نزول کا علم آیت کے فہم میں بہت مدد دیتا ہے کیونکہ سبب کا علم مسبب کے علم کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی بنیاد پر اسباب نزول پر مستقل کتابیں لکھی گئیں جن میں واحدی، جعبری اور سیوطی کی کتابیں مشہور ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ایک اشکال ہمیشہ سے موجود تھا: مفسرین نے بہت سی آیات کے ساتھ ایسے قصے اور حکایتیں بھی بیان کر دیں جن کا آیت کے حکم یا مفہوم کی تعیین سے کوئی حقیقی تعلق نہیں۔ بعض روایات ضعیف تھیں، بعض اسرائیلی قصے تھے، اور بعض صرف اس لیے نقل ہوئیں کہ آیت کے الفاظ سے مشابہت رکھنے والا کوئی واقعہ کسی دور میں پیش آیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قاری آیت کے اصل مفہوم کے بجائے ان قصوں میں الجھ کر رہ گیا۔ شاہ ولی اللہ نے اسی صورت حال کو دیکھ کر مسئلے کی نئی تفہیم پیش کی۔

شاہ ولی اللہ کی بنیادی تقسیم: دو قسم کے اسباب

شاہ ولی اللہ کی بحث کی بنیاد الفوز الکبیر کے اس اصول پر ہے کہ نزول قرآن کے وہ واقعات جنہیں اسباب نزول کہا جاتا ہے، دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم وہ اسباب ہیں جن کے بغیر آیت کا مفہوم ہی متعین نہیں ہوتا اور حکم کی نوعیت سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسی آیات میں سبب نزول کی معرفت لازمی ہے، کیونکہ ان میں کوئی اجمال، کوئی اشارہ یا ایسا واقعہ مضمر ہوتا ہے جسے جانے بغیر آیت ناتمام رہتی ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک ایسی آیات کی تعداد بہت محدود ہے، پورے قرآن میں گنی چنی آیات ایسی ہیں جن کی تفسیر حقیقی سبب نزول پر موقوف ہے۔

دوسری قسم وہ واقعات و قصص ہیں جو بظاہر کسی آیت کے ساتھ بیان کر دیے جاتے ہیں مگر آیت کا مفہوم ان کے بغیر بھی پوری طرح واضح اور خود کفیل ہوتا ہے۔ یہ قصے دراصل یا تو آیت کے حکم کی تاریخی تمثیل ہوتے ہیں، یا آیت کے مضمون سے مناسبت رکھنے والا کوئی بعد کا واقعہ، یا کسی راوی کی طرف سے محض توضیح کی ایک صورت۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مفسرین کی بیان کردہ اسباب نزول کی بڑی اکثریت

اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے، اور ان قصوں کو آیت کا حقیقی سبب سمجھ لینا علمی غلطی ہے۔ اس تقسیم سے مسئلے کی اصل نوعیت واضح ہو گئی کہ تنازعہ سبب نزول کی اہمیت کا نہیں، اس کی درست شناخت کا ہے۔

شانِ نزول اور سببِ نزول میں فرق

شاہ ولی اللہ کے نقطۂ نظر کی وضاحت میں ایک اہم نکتہ شان نزول اور سبب نزول کا فرق ہے۔ بہت سی آیات کسی مخصوص واقعے کے سبب نہیں اتریں بلکہ امت کی عمومی ضرورت، تربیت اور رہنمائی کے لیے نازل ہوئیں؛ ان آیات کے ساتھ جو واقعات ملتے ہیں وہ ان کی شان و حیثیت کی طرف اشارہ تو کرتے ہیں مگر انہیں سبب قرار دینا درست نہیں۔ اسی طرح بعض آیات کے تحت مفسرین کسی ایسے واقعے کو نقل کر دیتے ہیں جس میں آیت کا حکم منطبق ہوتا ہے، حالانکہ آیت اس واقعے سے پہلے یا بعد میں کسی اور پس منظر میں اتری تھی۔ ایسے واقعے کو انطباق کہنا چاہیے، سبب نزول نہیں۔

شاہ صاحب اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ اکثر آیات کا نزول اسباب سے پاک ہے؛ وہ کسی سوال یا واقعے کے جواب میں نہیں اتریں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت ابتداءً امت کی ہدایت کے لیے نازل فرمائیں۔ عقائد، اخلاق، قصص انبیاء اور احکام کی بڑی تعداد اسی قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا ہر آیت کے لیے سبب تلاش کرنے کی کوشش خود قرآن کے اسلوب نزول کے خلاف ہے۔ اس نکتے نے ان محققین

کو بھی مطمئن کیا جو اسباب نزول کی کثیر روایات کی سندی حیثیت سے پریشان تھے، اور ان مفسرین کو بھی تنبیہ کی جو قصوں کو تفسیر کا اصل سمجھ بیٹھے تھے۔

اصولِ عبرت اور عمومِ لفظ کی حمایت

شاہ ولی اللہ اسباب نزول کی بحث میں اس مشہور اصولی قاعدے کی بھی توثیق کرتے ہیں کہ العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص السبب، یعنی اعتبار لفظ کے عموم کا ہے، سبب کی خصوصیت کا نہیں۔ اگر کوئی حکم کسی خاص واقعے کے موقع پر نازل ہوا ہو مگر اس کے الفاظ عام ہوں تو حکم بھی عام رہے گا اور اس واقعے تک محدود نہیں ہو گا۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہی قاعدہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سبب نزول کی معرفت مفید ضرور ہے مگر حکم کو اس کی قید میں رکھنا غلط ہے؛ ورنہ قرآن کے بیشتر احکام اپنے زمانے کے چند واقعات میں محصور ہو کر رہ جائیں گے اور قرآن کی ابدی رہنمائی کا دعویٰ ختم ہو جائے گا۔

البتہ شاہ صاحب اس باریکی کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کہ بعض مقامات پر مفہوم کی تعیین خود سبب ہی سے ہوتی ہے، جیسے جہاں آیت میں کسی واقعے کی طرف اشارہ ہو یا کوئی ضمیر بے مرجع ہو۔ ان مقامات پر سبب نزول کا علم اجمال کھول دیتا ہے۔ مثال کے طور پر آیات لعان کا نزول حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کے واقعے پر ہوا، آیات ظہار کا پس منظر حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کی شکایت ہے، اور

آیات افک کا سبب واقعہ افک ہے؛ ان مقامات کو واقعات کے بغیر سمجھنا دشوار ہے۔ یوں شاہ صاحب کا مسلک انکار و اثبات کے درمیان کا متوازن مسلک ہے: جہاں سبب ضروری ہے وہاں اسے تسلیم کیا جائے اور جہاں قصہ محض توضیحی ہے وہاں اسے اسی درجے میں رکھا جائے۔

اثرات و نتیجہ

شاہ ولی اللہ کے اس نقطۂ نظر کے دور رس اثرات ہوئے۔ ایک طرف اس سے تفسیر کو اسرائیلیات اور ضعیف قصص کے بوجھ سے نجات دلانے کی راہ نکلی، اور دوسری طرف سبب نزول کی حقیقی اہمیت بھی محفوظ رہی۔ بعد کے مصلح مفسرین اور بالخصوص برصغیر کے اہل علم نے اس اصول کو اپنایا اور ترجمہ و تفسیر میں ان قصوں کی نشان دہی کرنا شروع کی جو آیت کی تشریح کے لیے غیر ضروری تھے۔ جدید محققین جب اسباب نزول کی روایات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو شاہ صاحب کی یہ بحث اس کی پیش رو ثابت ہوتی ہے، کیونکہ انہوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں اس مسئلے کی وہی تشخیص کر دی تھی جو آج بھی علمی حلقوں میں معتبر سمجھی جاتی ہے۔

نتیجتاً کہا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اسباب نزول کے منکر نہیں بلکہ اس کے محقق و مصلح تھے۔ ان کا نقطۂ نظر تین اصولوں میں سمٹ آتا ہے: اول، حقیقی اسباب نزول محدود ہیں اور ان کی معرفت ان جگہوں پر لازم ہے جہاں مفہوم ان پر موقوف ہو؛ دوم، مفسرین کے نقل کردہ اکثر قصے اسباب نہیں بلکہ توضیحی واقعات ہیں جنہیں اسی حیثیت سے لینا چاہیے؛ سوم، حکم کا مدار لفظ کے عموم پر ہے، سبب کی خصوصیت پر نہیں۔ یہی متوازن روش طالب علم کو اسباب نزول کے مطالعے میں درست سمت عطا کرتی ہے۔

سوال نمبر 2 (20 نمبر)

حفاظتِ قرآن کریم کے محرکات اور عملی اسباب بیان کریں۔

تعارف

قرآن کریم کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ چودہ سو سال سے اپنے اصل متن کے ساتھ محفوظ ہے؛ دنیا کی کوئی دوسری مذہبی کتاب یہ دعویٰ نہیں کر سکتی۔ یہ حفاظت اتفاقی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جو اس نے خود فرمایا: بے شک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں (سورۃ الحجر: 9)۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس حفاظت کو اسباب کے ذریعے ظاہر فرمایا؛ بعض اسباب اندرونی محرکات تھے جنہوں نے دلوں کو قرآن کی طرف مائل کیا، اور بعض اسباب عملی انتظامات تھے جن کے ذریعے یہ حفاظت واقع ہوئی۔ اس جواب میں دونوں پہلوؤں کا مفصل جائزہ لیا جائے گا۔

محرکات اور اسباب میں فرق یہ ہے کہ محرکات وہ کیفیات و دواعی ہیں جن سے انسانوں کے دلوں میں قرآن کو محفوظ رکھنے کی تڑپ پیدا ہوئی، جیسے عقیدہ، محبت اور ثواب کی امید؛ جبکہ عملی اسباب وہ ظاہری تدابیر ہیں جن کے ذریعے یہ کام انجام پایا، جیسے کتابت، حفظ، جمع اور تدوین۔ دونوں کے ملنے سے حفاظت کا نظام مکمل ہوا، اور یہی ترکیب اس کی کامیابی کا راز ہے۔

محرکات: عقیدت، محبت اور عبادت کی ضرورت

حفاظت قرآن کا سب سے بڑا محرک یہ عقیدہ تھا کہ یہ عین اللہ کا کلام ہے۔ جس کتاب کو انسان اپنے رب کا خط تصور کرے وہ اس کے ایک ایک حرف کی حفاظت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیتا ہے۔ صحابہ کرام کی قرآن سے محبت ضرب المثل تھی؛ وہ اسے راتوں کو نمازوں میں پڑھتے، اس کی آیات پر غور کرتے اور اس کے احکام پر جان دینے کو تیار رہتے۔ یہی جذبہ تھا جس نے حفظ کی اس عظیم تحریک کو جنم دیا جس میں ہزاروں صحابہ حافظ بنے۔

دوسرا محرک عبادت کی عملی ضرورت تھی۔ نماز قرآن کے بغیر ممکن نہیں؛ ہر نماز میں سورۃ الفاتحہ لازمی ہے اور اس کے ساتھ کچھ آیات کی تلاوت مطلوب ہے۔ ہر مسلمان کو کم از کم اتنا قرآن یاد کرنا ہی پڑتا تھا جتنا نماز کے لیے ضروری ہے اور وضو و غسل سے لے کر نکاح و جنازے تک زندگی کے ہر مرحلے پر قرآن حاضر تھا۔ تیسری محرک ثواب و ترغیب تھا: حدیث میں قرآن کے ایک حرف پر دس نیکیاں بتائی گئیں، حافظ قرآن کو قیامت کے دن خاص مقام و شفاعت کی بشارت دی گئی، اور رمضان میں ختم قرآن کی فضیلت نے سالانہ دور کا نظام بنا دیا۔ چوتھا محرک قرآن کی داعیانہ حیثیت تھی؛ مبلغین اور قاریوں کو قبائل کی طرف بھیجا جاتا تھا، جس سے قرآن ہر خطے میں زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں پہنچا۔

عملی سبب اول: کتابت وحی عہد نبوی میں

عملی اسباب میں سب سے پہلا سبب کتابت وحی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے نزول کے فوراً بعد اسے لکھوانے کا باقاعدہ انتظام فرمایا۔ کاتبین وحی کی ایک جماعت مقرر تھی جن میں حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب، حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کاتب کو بلا کر فرماتے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں جگہ لکھو؛ یوں سورتوں میں آیات کی ترتیب بھی توقیفی طور پر لکھی جاتی رہی۔ کتابت کے لیے اس دور کے دستیاب ذرائع استعمال ہوئے: چمڑے کے ٹکڑے، کھجور کی شاخیں، پتلے پتھر، کپڑا اور جانوروں کی ہڈیاں۔

یہ کتابت محض خانہ پری نہ تھی بلکہ اس کے بعد آپ لکھا ہوا سن کر تصدیق بھی فرماتے۔ اسی دور میں کئی صحابہ کے پاس اپنے ذاتی مجموعے بھی تیار ہوئے۔ کتابت وحی نے یہ فائدہ دیا کہ قرآن کا متن حفظ کے ساتھ ساتھ تحریری صورت میں بھی موجود رہا، اور بعد میں جمع قرآن کے موقع پر یہی تحریریں سند کا کام دے گئیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کتابت کا یہ سلسلہ نزول کے پہلے دن سے آخری دن تک بلا انقطاع جاری رہا۔

عملی سبب دوم: حفظ اور عرضے کا نظام

دوسرا بڑا سبب حفظ کا وسیع نظام تھا۔ عرب قوم کی حافظے کی قوت مشہور تھی، اور قرآن نے اس قوت کو اپنا سب سے بڑا محافظ بنا لیا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں صحابہ حافظ قرآن تھے؛ جنگ یمامہ میں ستر قاریوں کی شہادت کا واقعہ اس بات کا اندازہ دیتا ہے کہ حفاظ کی تعداد کتنی بڑی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حفظ کی ترغیب بھی دی اور اس کی نگرانی بھی فرمائی؛ آپ صحابہ سے قرآن سنتے اور ان کی قراءت کی تصحیح فرماتے۔ اصحاب صفہ کا تعلیمی مرکز اور مساجد میں حلقہ درس اسی نظام کی صورتیں تھیں۔

حفظ کے ساتھ عرضے کا نظام حفاظت کو دوگنا مضبوط کرتا تھا۔ ہر سال رمضان میں حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا دور کراتے اور آخری سال یہ دور دو مرتبہ ہوا، جسے عرضہ اخیرہ کہا جاتا ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اس عرضے میں حاضر تھے اور بعد میں جمع قرآن کی ذمہ داری بھی انہی کو ملی، گویا حفظ کا سرکاری ریکارڈ اپنے اعلیٰ ترین معیار سے گزرا۔ اس نظام نے لفظ و تلفظ دونوں کو محفوظ کر دیا، اور تواتر کی صورت میں یہ سلسلہ نسل در نسل آج تک جاری ہے؛ آج بھی دنیا میں لاکھوں حفاظ موجود ہیں جو پورا قرآن سینوں میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔

عملی سبب سوم: جمع صدیقی و جمع عثمانی

تیسرا اور فیصلہ کن سبب قرآن کا باقاعدہ جمع ہونا ہے۔ جنگ یمامہ میں حفاظ کی شہادت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قرآن کو ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے غیر معمولی احتیاط سے یہ کام کیا: وہ کوئی آیت اس وقت تک درج نہ کرتے جب تک اس کی تحریر اور کم از کم دو گواہوں کی شہادت موجود نہ ہوتی۔ یہ مجموعہ صحف کی صورت میں حضرت ابو بکر، پھر حضرت عمر اور پھر ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ رہا۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب اسلام دور دراز علاقوں میں پھیلا اور قراءت کے اختلافات کی شکایات آنے لگیں تو انہوں نے انہی صحف کی بنیاد پر سرکاری نسخے تیار کروائے اور بڑے شہروں میں بھیج دیے، ساتھ ماہر قاری بھی مقرر کیے اور غیر سرکاری ذاتی نسخوں کو اس معیار کے مطابق درست کرنے کا حکم دیا۔ اس عمل کو جمع عثمانی یا توحید مصاحف کہتے ہیں۔ اسی کے نتیجے میں آج پوری دنیا میں قرآن کا ایک ہی رسم و متن ہے، جبکہ دیگر آسمانی کتابوں کے متعدد متنداول نسخے اس کے برعکس صورت حال پیش کرتے ہیں۔

عملی سبق چہارم: رسم، اعراب اور اشاعت کی تدابیر

چوتھے درجے کے اسباب میں مصحف کی رسم کی پابندی، نقط و اعراب کا اضافہ اور اشاعت کے ذرائع آتے ہیں۔ جب عجمی اقوام اسلام میں داخل ہوئیں تو غلط تلفظ کا خدشہ پیدا ہوا؛ چنانچہ ابوالاسود دئلی نے اعراب کی بنیاد رکھی، نصر بن عاصم و یحییٰ بن یعمر نے حروف کی شناخت کے لیے نقطے مقرر کیے اور خلیل بن احمد فراہیدی نے موجودہ حرکات و علامات کو تکمیل دی۔ ان تدابیر نے متن کو آئندہ نسلوں کے لیے لب و لہجے سمیت درست رکھا۔

اسی طرح خطاطی کی روایت نے مصاحف کو فن و احتیاط کے ساتھ نقل کیا، مطابع کی ایجاد کے بعد سرکاری نگرانی میں چھپنے والے مصاحف نے اشاعت کو عالمگیر و ہم آہنگ بنا دیا؛ مملکت سعودی عرب کا مجمع الملک فہد تو اس میدان کا سب سے بڑا ادارہ ہے جس کے چھاپے ہوئے مصاحف پوری دنیا میں معیار سمجھے جاتے ہیں۔ جدید دور میں صوتی ریکارڈنگ، ڈیجیٹل نسخے اور تصدیقی اداروں نے حفاظت کے اسباب کو مزید

وسعت دے دی ہے۔ یہ سب اسباب اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ حفاظت قرآن ایک مسلسل اور منظم عمل ہے جو ہر دور میں اپنے تقاضوں کے ساتھ جاری رہا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ حفاظت قرآن کے محرکات میں عقیدت و محبت، عبادت کی ضرورت، ثواب کی ترغیب اور دعوت کا تقاضا شامل ہیں، جبکہ عملی اسباب میں کتابت وحی، حفظ و عرضہ، جمع صدیقی، توحید عثمانی، رسم و اعراب اور منظم اشاعت نمایاں ہیں۔ ان دونوں ستونوں پر کھڑی عمارت کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن آج بھی حرف بحرف اسی صورت میں موجود ہے جس میں نازل ہوا اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے امت کے حوالے کیا۔ یہی حفاظت قرآن کے خصائص میں سے ایک عظیم خصوصیت اور اس کے الٰہی ہونے کی جیتی جاگتی دلیل ہے۔

سوال نمبر 3 (20 نمبر)

خصائصِ قرآن پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

تعارف

خصائص سے مراد وہ امتیازی صفات ہیں جن کی بنیاد پر کوئی چیز دوسروں سے الگ اور ممتاز ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی متعدد ایسی خصوصیات ہیں جو اسے دنیا کی تمام کتابوں سے، حتیٰ کہ سابقہ آسمانی کتابوں سے بھی ممتاز کرتی ہیں۔ ان خصائص کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ اس سے طالب علم کو قرآن کی حقیقی قدر و منزلت کا ادراک ہوتا ہے اور یہ بات دلیل کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن محض ایک مذہبی صحیفہ نہیں بلکہ ایک معجز اور ابدی نظام ہدایت ہے۔ اس نوٹ میں قرآن کے اہم خصائص کو تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

علماء نے خصائص قرآن کو مختلف انداز سے شمار کیا ہے۔ بعض نے اس کے نزول و حفاظت سے متعلق صفات بیان کیں، بعض نے اس کے مضامین و اسلوب کی خصوصیات لکھیں، اور بعض نے اس کے اثرات و نتائج کو اس کی تخصیص قرار دیا۔ ذیل میں ان تمام پہلوؤں کو یکجا کر کے ایک جامع تصویر پیش کی گئی ہے۔

خصوصیت اول: کلامِ الٰہی اور معجز ہونا

قرآن کی سب سے پہلی اور بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عین اللہ کا کلام ہے، کسی انسان کا قول نہیں۔ اس کے الفاظ و معانی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں اور یہی بات اسے انجیل و تورات کے موجودہ ترجموں اور تفسیری صورتوں سے بھی الگ کرتی ہے۔ اسی سے جڑی دوسری خصوصیت اس کا معجز ہونا ہے۔ قرآن نے اپنے جیسا کلام پیش کرنے کا چیلنج دیا، پہلے پورے قرآن جیسی کتاب کا، پھر دس سورتوں کا، اور آخر

میں ایک سورت کا چیلنج دیا گیا (سورۃ ہود: 13، سورۃ یونس: 38، سورۃ البقرۃ: 23)، مگر اہل عرب، جو فصاحت کے امام تھے، اس چیلنج کا جواب نہ دے سکے اور بجائے اس کے مقابلہ کلام کے انہوں نے تلوار اٹھالی، جو اس عجز کی سب سے بڑی گواہی ہے۔

اعجاز کے پہلو متعدد ہیں: اعجاز بیانی یعنی فصاحت و بلاغت کا وہ معیار جو انسانی بس سے باہر ہے؛ اعجاز غیبی یعنی مستقبل کی وہ خبریں جو حرف بحرف پوری ہوئیں، جیسے رومیوں کی فتح کی پیشین گوئی؛ اعجاز تشریعی یعنی ایسا متوازن نظام قانون جو ہر دور میں قابل عمل ہو؛ اور اعجاز تاثیری یعنی دلوں کو موم کر دینے کی وہ قوت کہ عمر بن خطاب جیسے سخت دل انسان بھی تلاوت سن کر بدل گئے۔ ان پہلوؤں کا مجموعہ قرآن کو معجزہ خالدہ بناتا ہے، یعنی ایسا معجزہ جو قیامت تک باقی ہے اور ہر دور میں اپنے مدمقابل کو چیلنج کرتا رہتا ہے۔

خصوصیت دوم: محفوظیت اور عدم اختلاف

تیسری خصوصیت حفاظت ہے جس کا ذکر سورۃ الحجر کی آیت نمبر 9 میں وعدے کی صورت میں آیا ہے۔ قرآن اپنے نزول کے دن سے لے کر آج تک سینوں اور سطروں دونوں میں محفوظ ہے، اس کے ایک حرف و حرکت میں بھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کی حفاظت کا ثبوت تواتر ہے: ہر دور میں اتنے کثیر حفاظ و نسخے موجود رہے ہیں کہ کسی تبدیلی کا تصور محال ہے؛ دور دراز علاقوں کے قدیم ترین نسخے باہم موافق ہیں۔

چوتھی خصوصیت عدم اختلاف ہے۔ قرآن خود فرماتا ہے کہ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے (سورۃ النساء: 82)۔ تیئس برس کے مختلف حالات میں نازل ہونے کے باوجود قرآن میں نہ داخلی تضاد ہے نہ کسی علمی حقیقت سے ٹکراؤ۔

اس کے برعکس انسانی تصانیف میں تدریج کے ساتھ تناقض پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ہم آہنگی دراصل اس کے مآخذ کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ اس وصف نے مسلمانوں کو بھی یہ اصول دیا کہ کسی بھی کتاب یا قول کو پرکھنے کا معیار اس کی داخلی ہم آہنگی ہے۔

خصوصیت سوم: اخریت، جامعیت اور کمال

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن آخری آسمانی کتاب ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں؛ اس کے بعد نہ کوئی کتاب آئے گی نہ کوئی نبی، اسی لیے اس کی شریعت ابدی اور اس کی حفاظت کی ضمانت بھی دی گئی۔ چوتھی خصوصیت جامعیت ہے: قرآن نے خود اپنے بارے میں فرمایا کہ ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (سورۃ الانعام: 38) اور اسے ہر چیز کی وضاحت کرنے والا (سورۃ النحل: 89)۔ اس جامعیت کا مطلب اصول و کلیات کی جامعیت ہے: عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت، معیشت، سیاست اور تمدن، ہر شعبے کے بنیادی اصول اس میں موجود ہیں جن کی تفصیل سنت اور اجتہاد سے مرتب ہوتی ہے۔

ساتویں خصوصیت کمال و اتمام ہے؛ سورۃ المائدہ میں اعلان کیا گیا کہ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی (سورۃ المائدۃ: 3)۔ یہ کمال اس لحاظ سے ہے کہ اب انسانی ہدایت کے بنیادی نظام کو کسی اضافے کی ضرورت نہیں؛ اب آنے والے مسائل کا حل اسی نظام کے اصولوں سے نکالا جائے گا۔ سابقہ کتابیں جزوی اور قومی حیثیت رکھتی تھیں، جبکہ قرآن کا یہ کمال اسے آخری مرتبے کی عالمگیر شریعت بناتا ہے۔

خصوصیت چہارم: عالمگیریت، ابدیت اور سہولت

آٹھویں خصوصیت عالمگیریت ہے: قرآن کسی ایک قوم یا خطے کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے، اسی لیے اس کا خطاب اکثر یا ایھا الناس ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین اور کافۃ للناس بھیجے جانے کا اعلان کیا گیا۔ نویں خصوصیت ابدیت و ہمہ زمانی صلاحیت ہے: اس کے احکام ایسے متوازن ہیں کہ ہر دور و تہذیب میں ان کا اطلاق ممکن ہے، جس کی بنیاد یہ ہے کہ اس نے فروع و جزئیات کے بجائے اصول و مقاصد پر زور دیا اور اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ چودہ صدیوں میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں قرآن سے رہنمائی لینا ممکن نہ رہا ہو۔

دسویں خصوصیت تیسیر و سہولت ہے: اللہ نے فرمایا کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے، سو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا (سورۃ القمر: 17)۔ یہ آسانی تلاوت میں بھی ہے، حفظ میں بھی اور فہم کی بنیادی سطح میں بھی؛ غیر عرب بچے بھی اسے روانی سے یاد کر لیتے ہیں اور عام قاری بھی اس کے اساسی مضامین سے جڑ جاتا ہے، جبکہ اہل علم کے لیے اس میں معرفت کے بے پایاں سمندر ہیں۔ یہی دوہری صلاحیت کسی اور کتاب کو نصیب نہیں: سطح پر سادگی اور گہرائی میں بحر بے کنار۔

خصوصیت پنجم: ہدایت، شفاء اور تاثیر

گیارہویں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن محض معلومات کی کتاب نہیں بلکہ ہدایت وشفاء کی کتاب ہے۔اس نے اپنے آپ کو ہدی للناس،شفاء لما فی الصدور اور موعظہ کہا ہے۔اس کی ہدایت زندگی کے انفرادی، خاندانی، سماجی اور بین الاقوامی تمام دائروں کو محیط ہے۔اس کا شفاء ہونا دو طرح کا ہے: روحانی امراض یعنی شرک، نفاق، حسد، کبر اور شہوات کی شفاء،اور اس کے ساتھ بعض جسمانی علاج میں بھی تلاوت کی برکات روایات میں آئی ہیں۔تیرہویں صدی کے مشہور کلمات میں یہ بات شامل ہے کہ قرآن نے جس معاشرے کو بدلا وہ قصہ کہانیوں کا معاشرہ تھا جس نے چند دہائیوں میں دنیا کی مہذب ترین تہذیب کی بنیاد ڈال دی۔

بارہویں خصوصیت اس کی اثر انگیزی و حلاوت ہے۔قرآن کی تلاوت سے دلوں پر لرزہ طاری ہوتا، آنکھیں اشک بار ہو جاتیں؛خود قریش کے سخت دل سردار راتوں کو چھپ کر اسے سنتے تھے۔ولید بن مغیرہ کا یہ اعتراف تاریخ میں محفوظ ہے کہ اس کلام میں حلاوت ہے اور یہ انسان کے کلام پر غالب آتا ہے۔اس کے علاوہ قرآن مہیمن ہے یعنی سابقہ کتابوں پر نگران و گواہ ہے؛وہ ان کی اصلی تعلیمات کی تصدیق بھی کرتا ہے اور ان کی تحریفات کی تصحیح بھی۔یہ تمام صفات مل کر قرآن کو وہ منفرد مقام دیتی ہیں جو دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کلام الٰہی و معجز ہے، کاملاً محفوظ و بے اختلاف ہے، آخری، جامع و مکمل ہے، عالمگیر و ابدی ہے، تلاوت و فہم میں آسان ہے اور ہدایت وشفاء کا سرچشمہ ہے۔یہ خصائص اس کے دنیوی کلام سے ممتاز ہونے کی مدلل وجوہ ہیں اور یہی اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ

اس کے ساتھ امت کا تعلق محض برکت و تلاوت تک محدود نہ رہے بلکہ اسے فہم، تدبر اور عمل کی بنیاد بنایا جائے۔ جس کتاب میں یہ سب کمالات یکجا ہوں اسے زندگی کا دستور بنانا ہی عقل و ایمان دونوں کا تقاضا ہے۔

سوال نمبر 4 (20 نمبر)

نظمِ قرآن پر ایک تفصیلی نوٹ تحریر کریں۔

تعارف

نظم علوم القرآن کا وہ دلچسپ اور اہم موضوع ہے جس میں قرآن کریم کی آیات و سورتوں کی اس ترتیب و ربط کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس کے تحت ہر آیت اپنی جگہ پر اور ہر سورت اپنے محل پر بے مثال مناسبت کے ساتھ واقع ہے۔ نظم کا علم اس اعتراض کی تردید کرتا ہے جو بعض مستشرقین اور سطحی قارئین کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے کہ قرآن کے مضامین بے ترتیب اور منتشر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب قرآن کو نظم کے اصول سے پڑھا جائے تو یہ ایک مربوط و منظم کلام نظر آتا ہے جس کے اجزا موتیوں کی لڑی کی طرح پروئے ہوئے ہیں۔

اس نوٹ میں پہلے نظم کے لغوی و اصطلاحی مفہوم کی وضاحت ہو گی، پھر قرآن میں نظم کے وجود کے دلائل و مثالیں پیش ہوں گی، اس کے بعد اس علم کی تاریخی روایت، اس کی اقسام اور اعجاز قرآن سے اس کے تعلق کا بیان آئے گا۔ آخر میں اس علم کے فوائد اور نتیجہ درج کیا جائے گا۔

نظم کا مفہوم اور مناسبت سے تعلق

نظم کے لغوی معنی موتیوں کو دھاگے میں پرونا اور چیزوں کو ترتیب سے جوڑنا ہے۔ جب کسی کلام کے اجزاء باہم اس طرح جڑے ہوں کہ ہر جزء اپنے مناسب ترین مقام پر ہو اور سب مل کر ایک مکمل وحدت بنائیں تو اسے نظم کہتے ہیں۔ قرآنی اصطلاح میں نظم سے مراد آیات کا آیات سے اور سورتوں کا سورتوں سے وہ معنوی ربط و مناسبت ہے جس سے پورا کلام ایک واحد خطاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ علماء اس علم کو علم المناسبات بھی کہتے ہیں، اور تناسب سے مراد وہ ربط ہے جو دو آیتوں یا دو سورتوں کے درمیان سببی، زمانی یا معنوی تعلق کی صورت میں پایا جاتا ہے۔

یہ یاد رہے کہ قرآن کی ترتیب ترتیب نزول نہیں، ترتیب تلاوت ہے۔ یعنی سورتیں اور آیات اس ترتیب سے مصحف میں درج ہیں جس میں انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی ہدایت کے تحت رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نظم کی بحث کا مفروضہ یہ ہے کہ موجودہ ترتیب حکمت سے خالی نہیں؛ اگر ترتیب محض انسانی اجتہاد ہوتی تو بھی اہل علم نے اس میں مناسبات تلاش کیں، چہ جائیکہ ترتیب خود توقیفی ہو۔ نظم کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ ایک آیت کا اختتام اگلی آیت کی تمہید ہوتا ہے، ایک مضمون دوسرے مضمون کی تکمیل کرتا ہے، اور سورت کا آخری حصہ اس کے آغاز سے گہرا جڑا ہوتا ہے۔

قرآن میں نظم کے دلائل اور مثالیں

نظم کے وجود کی سب سے روشن مثال سورتوں کے داخلی ربط میں ملتی ہے۔ سورۃ الفاتحہ پورے قرآن کا اجمالی خاکہ ہے: اس میں ربوبیت، رحمت، مالکیت یوم الدین، عبادت و استعانت اور راہ راست کی دعا آ گئی، اور اس کے بعد آنے والی پوری کتاب اسی دعا کا جواب ہے؛ اسی لیے الفاتحہ کو ام القرآن کہا گیا۔ سورۃ البقرۃ میں نظم کا یہ پہلو بہت واضح ہے: افتتاح میں متقین کی صفات و کتاب کی ہدایت کا اعلان، درمیان میں بنی اسرائیل کی تاریخ، ملت ابراہیم، قبلے کی تبدیلی اور احکام کی تفصیل، اور اختتام میں ایمان کی جامع دعا و نصرت کی طلب، یہ سب ایک مرکزی محور یعنی نئی امت کی تشکیل و ہدایت کے گرد گھومتا ہے۔

سورتوں کے باہمی نظم کی مثالیں بھی نمایاں ہیں۔ سورۃ الفیل کے بعد سورۃ قریش کا آغاز لایلٰف قریش سے ہوتا ہے، جہاں پہلی سورت میں کعبے پر حملے کی ناکامی کا بیان ہے اور دوسری میں اسی امن کی نعمت کی یاد دہانی کے ساتھ عبادت کا حکم جڑا ہوا ہے۔ سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح تسلی کا ایک مسلسل سلسلہ بناتی ہیں۔ آیات کی سطح پر مثال کے طور پر سورۃ الکہف کا آغاز حمد سے ہوتا ہے اور اختتام بھی توحید کے اعلان و عمل صالح کی دعوت پر، جو پوری سورت کے مضمون کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسی طرح اکثر سورتوں میں افتتاح و اختتام کی مطابقت کو علماء نے نظم کی نمایاں قسم قرار دیا ہے۔

نظم کی اقسام

علماء و محققین نے نظم و مناسبت کی کئی اقسام بیان کی ہیں۔ پہلی قسم آیات کی باہمی مناسبت ہے، کہ ایک آیت سابقہ آیت کی تفسیر، تاکید یا تکمیل ہوتی ہے؛ مثلاً جہاں پہلی آیت میں اجمال ہو وہاں اگلی آیت تفصیل لاتی ہے۔ دوسری قسم فاصلہ آیات یعنی آیت کے اختتامی جملوں کی مناسبت ہے؛ قرآن کی آیات اکثر اسماء الٰہی پر ختم ہوتی ہیں اور ان اسماء کا آیت کے مضمون سے گہرا تعلق ہوتا ہے، جیسے مغفرت کے مضمون کے آخر میں غفور رحیم اور عذاب کے ذکر کے ساتھ عزیز حکیم کا آنا۔ تیسری قسم سورت کے آغاز و انجام کی مطابقت ہے۔

چوتھی قسم سورتوں کی باہمی مناسبت ہے کہ ایک سورت کا مضمون اگلی سورت سے کیسے جڑا ہے، اور پانچویں قسم قرآن کے بڑے مقاصد و موضوعات کے گرد مجموعی وحدت ہے۔ اسی طرح مناسبت کی علمی صورتیں بھی بیان کی گئی ہیں؛ کہیں نظیر سے نظیر جوڑا گیا ہے، کہیں ضد سے ضد کو نمایاں کیا گیا ہے، کہیں استطراد یعنی ضمنی بات کے بعد اصل مضمون کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ ان اقسام سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظم کا علم محض ذوقی دعویٰ نہیں بلکہ اس کے قابل مشاہدہ اصول و مظاہر ہیں جن کی بنیاد پر تفسیر میں اس کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

علم نظم کی تاریخی روایت

اگرچہ نظم کی بنیادیں ابتدائی مفسرین کے یہاں بکھری صورت میں موجود تھیں، مگر اسے منظم شکل دینے کا سہرا بعد کے علماء کے سر ہے۔ امام رازی (وفات 606ھ) نے اپنی تفسیر کبیر میں آیات کی مناسبات پر خاص توجہ دی اور کہا کہ قرآن کے اکثر لطائف اسی ترتیب و ربط میں پوشیدہ ہیں۔ اس کے بعد برہان الدین بقاعی (وفات 885ھ) نے اس فن کو اپنے عروج پر پہنچایا؛ ان کی آٹھ جلدوں پر مشتمل تفسیر نظم

الدرر فی تناسب الآیات والسور مکمل طور پر اسی علم کے لیے وقف ہے اور اس کا نام ہی اس کے موضوع کی گواہی دیتا ہے۔ امام ابو حیان اور علامہ آلوسی نے بھی اپنی تفسیروں میں مناسبات کی طرف اشارے کیے۔

جدید دور میں اس علم کو مولانا حمید الدین فراہی (وفات 1930ء) نے نئے اصولوں کے ساتھ زندہ کیا۔ فراہی نے نظم کو تفسیر کی اساس قرار دیا اور ہر سورت کے مرکزی مضمون یعنی عمود کا اصول وضع کیا۔ ان کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن میں اس اصول کو پورے قرآن پر لاگو کر کے دکھایا۔ یوں یہ علم قدیم روایت سے جدید تحقیق تک مسلسل ارتقاء پذیر رہا اور اس نے ثابت کیا کہ قرآن کے ربط کا مطالعہ محض کلاسیکی دلچسپی نہیں بلکہ زندہ تحقیقی میدان ہے۔

نظم اور اعجاز قرآن کا تعلق

نظم کا اعجاز سے گہرا تعلق ہے۔ عبد القاہر جرجانی نے دلائل الاعجاز میں یہ نظریہ پیش کیا کہ قرآن کا اعجاز اس کے مفردات میں نہیں بلکہ اس کے نظم میں ہے، یعنی کلمات کو اس خاص ترتیب و ترکیب سے پیش کرنے میں کہ اس سے معانی کی ایک ایسی صورت پیدا ہو جس کی مثال ممکن نہ ہو۔ جرجانی کے نزدیک الفاظ کا حسن ان کے باہمی تعلق اور نحوی ترکیب میں ہے؛ اس لیے مترادف لفظ بھی جگہ بدلنے سے کلام کا حسن ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے ترجمے اس کے اعجاز کی لذت منتقل نہیں کر سکتے؛ اعجاز عربی نظم میں مقید ہے۔

اسی بنیاد پر مستشرقین کا یہ اعتراض باطل ہو جاتا ہے کہ قرآن کے مضامین منتشر ہیں۔ انتشار اس وقت کہا جا سکتا تھا جب ترتیب انسانی ہوتی یا کلام بے مقصد ہوتا؛ جب ترتیب توقیفی ہے اور ہر سورت کا اپنا محور و مقصود موجود ہے تو انتشار کا الزام محض غور کی کمی کی پیداوار ہے۔ نظم کی معرفت سے مومن کا یقین بڑھتا ہے کہ یہ کلام کسی غیر مرتب انسانی فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ اس علیم و حکیم کا اتارا ہوا ہے جس نے اسے کامل ربط کے ساتھ نازل فرمایا۔

نظم کے علم کے فوائد اور نتیجہ

نظم کے مطالعے کے کئی فوائد ہیں: اس سے قرآن کی تفسیر درست سمت میں ہوتی ہے کیونکہ آیت کا مفہوم اس کے سیاق و سباق کے تناظر میں متعین ہوتا ہے؛ بے ربط تاویلات کا راستہ بند ہوتا ہے؛ قرآن کی وحدت موضوعی قاری کے دل میں اترتی ہے اور تلاوت میں تدبر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے؛ اور اعجاز قرآن پر ایمان دلیل و ذوق دونوں سے پختہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے اسباب نزول کی طرح مناسبات کو بھی فہم قرآن کے ذرائع میں شمار کیا ہے۔

نتیجتاً نظم قرآن ایک مسلم حقیقت ہے: آیات کا آیات سے، سورت کا اپنے اندر اور سورتوں کا باہم ایسا ربط موجود ہے جو اس کتاب کو ایک مکمل وحدت بناتا ہے۔ اس ربط کی تلاش رازی و بقاعی سے لے کر فراہی و اصلاحی تک علماء کی سعی کا مرکز رہی ہے۔ طالب علم کے لیے حاصل

مطالعہ یہ ہے کہ قرآن کو پڑھتے وقت صرف انفرادی آیات پر نظر نہ رکھی جائے بلکہ سورت کے مرکزی مضمون اور آیات کے تسلسل کو بھی پیش نظر رکھا جائے؛ یہی تدبر کا درست طریقہ اور نظم قرآن کی معرفت کا اصل ثمر ہے۔

سوال نمبر 5 (20 نمبر)

نظم و سورِ قرآن کے بارے میں امین احسن اصلاحی کا نقطۂ نظر مثالوں سے واضح کریں۔

تعارف

مولانا امین احسن اصلاحی (1904ء تا 1997ء) برصغیر کے ممتاز مفسر اور مولانا حمید الدین فراہی کے شاگرد رشید تھے۔ ان کی شاہکار تفسیر تدبر قرآن نو جلدوں میں اسی اصول پر لکھی گئی ہے کہ قرآن ایک منظم و مربوط کلام ہے جس کی ہر سورت کا اپنا مرکزی مضمون ہے اور سورتیں باہم گروہوں اور جوڑوں کی صورت میں جڑی ہوئی ہیں۔ اصلاحی کا نقطۂ نظر اس لحاظ سے انقلابی تھا کہ انہوں نے نظم کو تفسیر کی بنیاد بنا دیا اور اس بنیاد پر بہت سے دیرینہ تفسیری مسائل کا نیا حل پیش کیا۔ اس جواب میں ان کے اصولوں کو مثالوں کے ساتھ واضح کیا جائے گا۔

اصلاحی کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب توقیفی ہے، آیات و سورتوں کا ربط حکمت سے خالی نہیں، اور اگر کوئی قاری اس ربط کو نظر انداز کر کے آیات کو بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح پڑھے گا تو وہ قرآن کے اصل مقصد و نظام کو نہیں پا سکے گا۔ ان کے نظام کو تین

بڑے ستونوں پر سمجھا جا سکتا ہے: ہر سورت کا عمود، سورتوں کے ازواج (جوڑے)، اور پورے قرآن کے سات گروہ۔ ذیل میں تینوں کی وضاحت مثالوں کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

پہلا اصول: ہر سورت کا عمود (مرکزی موضوع)

اصلاحی کے نزدیک ہر سورت کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جسے وہ عمود کہتے ہیں، اور سورت کی تمام آیات خواہ کتنے ہی متنوع عنوانات پر ہوں، اسی عمود کے گرد گھومتی ہیں۔ تفسیر کا پہلا قدم یہ ہے کہ پورا کلام سورت میں پڑھ کر اس کے عمود کی تعیین کی جائے؛ اس کے بعد ہر آیت کا مفہوم اسی روشنی میں متعین ہو گا۔ اصلاحی کے نزدیک عمود کی تلاش قیاس آرائی نہیں بلکہ خود سورت کے خطاب، اس کے مخاطبین، اس کے افتتاح و اختتام اور اس کے غالب مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر سورۃ یوسف کا عمود اصلاحی کے مطابق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کے لیے مخفی تدابیر سے راستے بناتا ہے اور اس کے وعدے کی تکمیل ہو کر رہتی ہے، چاہے ظاہری اسباب کتنے ہی مایوس کن ہوں؛ کنویں میں ڈالا جانا، غلامی، قید اور پھر مصر کی وزارت تک کا پورا قصہ اسی عمود کی تفسیر ہے۔ اسی طرح سورۃ الکہف کا عمود اصلاحی کے نزدیک دین کے راستے میں پیش آنے والے فتنوں و آزمائشوں سے بچاؤ اور اللہ کی طرف رجوع کا بیان ہے؛ اصحاب کہف کا واقعہ، صاحب جنتین کا قصہ، موسیٰ و خضر کا سفر اور ذوالقرنین کا ذکر اسی ایک موضوع کی چار مختلف صورتیں ہیں۔ عمود کا یہ اصول بظاہر بکھرے مضامین کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔

دوسرا اصول: سورتوں کے ازواج (جوڑے)

اصلاحی کے نظام کا دوسرا ستون یہ ہے کہ سورتیں عموماً جوڑوں (ازواج) کی صورت میں ہیں؛ ہر جوڑے کی دو سورتیں ایک دوسرے سے تکمیلی تعلق رکھتی ہیں: ایک میں جو مضمون اجمالاً ہو دوسری میں وہ تفصیلی ہوتا ہے، ایک میں دعویٰ ہو تو دوسری میں دلیل، یا ایک مکی ہو تو اس کا جوڑا مدنی صورت میں اس کی تکمیل کرتا ہے۔ دونوں سورتیں مل کر ایک موضوع کو پورا کرتی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے دن و رات یا دیگر ازواج باہم تکمیل کرتے ہیں۔ اصلاحی نے اس اصول کی بنیاد قرآن کے اس فرمان میں رکھی کہ اس نے ہر چیز کو جوڑا پیدا کیا اور قرآن نے خود اپنے بیان کو مثانی یعنی دہرائی جانے والی جوڑی دار صورت کہا ہے۔

اس کی واضح مثال سورۃ الفیل اور سورۃ قریش ہیں: پہلی سورت میں کعبے کی حفاظت کا تاریخی واقعہ بیان ہوا اور دوسری اسی واقعے کے ثمرے کے طور پر قریش کی امن و رزق کی نعمت اور اس پر عبادت کے مطالبے سے شروع ہوتی ہے؛ لام لایلاف پہلی سورت کے مضمون کو جوڑنے والا واضح ربط ہے۔ دوسری مثال سورۃ الضحیٰ و سورۃ الانشراح ہے جہاں دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی و بشارت کا موضوع ایک تسلسل سے آگے بڑھتا ہے۔ تیسری مثال سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران ہے جن کا جوڑا اصلاحی کے نزدیک ملت ابراہیم و اہل کتاب کے موضوع پر تکمیل کرتا ہے، اور آخری سورتوں میں الفلق و الناس بھی معوذتین کی صورت میں جوڑا بناتی ہیں۔ چند سورتیں اصلاحی کے نزدیک منفرد یا ضمیمہ کی حیثیت رکھتی ہیں، جن میں الفاتحہ پورے قرآن کی تمہید و مقدمہ ہونے کی وجہ سے سب سے نمایاں ہے۔

تیسرا اصول: قرآن کے سات گروہ

اصلاحی نے پورے قرآن کی سورتوں کو سات بڑے گروہوں (مجموعوں) میں تقسیم کیا ہے، اور ہر گروہ کا اپنا غالب مرکزی موضوع ہے۔ یہ گروہ ان کے نزدیک اس طرح ہیں: پہلا گروہ الفاتحہ سے المائدہ تک، جس کا مرکز شریعت و امت کی تشکیل ہے؛ دوسرا گروہ الانعام سے التوبہ تک، جس میں مکی و مدنی دونوں ادوار کی تکمیل اور مشرکین و منافقین سے آخری براءت کا اعلان ہے؛ تیسرا گروہ یونس سے النور تک؛ چوتھا الفرقان سے الاحزاب تک؛ پانچواں سبا سے الحجرات تک؛ چھٹا ق سے التحریم تک؛ اور ساتواں گروہ الملک سے الناس تک۔ ان گروہوں کی تقسیم میں اصلاحی نے سورتوں کے مضامین، ان کے ادوارِ نزول اور ان کے ازواج کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

اس تقسیم کی ایک اہم خصوصیت اصلاحی کے نزدیک یہ ہے کہ ہر گروہ کے اندر پہلے مکی سورتیں آتی ہیں پھر مدنی، گویا ہر گروہ میں دین کی دعوت کا ایک پورا دور اپنے اتمام کو پہنچتا ہے: پہلے عقیدہ و انذار کا مرحلہ، پھر امت و شریعت کی تکمیل۔ مزید یہ کہ ہر گروہ کا موضوع اس کے آغاز میں کلیدی سورت سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کی آخری سورتیں اس موضوع کا نچوڑ پیش کرتی ہیں۔ یوں سات گروہوں کا یہ نظام پورے قرآن کو سات بڑے ابواب پر مشتمل ایک واحد کتاب کے طور پر پیش کرتا ہے جس میں کوئی حصہ بے محل نہیں۔

مثالی تطبیق: چند نمایاں جھلکیاں

اصلاحی کے اصولوں کی تطبیق کی سب سے دلچسپ مثال سورۃ الفاتحہ کا تجزیہ ہے۔ ان کے نزدیک الفاتحہ جوڑے یا گروہ کی سورت نہیں بلکہ پوری کتاب کا مقدمہ و فہرست ہے: اس میں قرآن کے تمام بڑے موضوعات اجمالاً موجود ہیں، اور بعد کی تمام سورتیں اسی کے مضامین کی تفصیل ہیں۔ اسی طرح پہلے گروہ میں البقرہ سے لے کر المائدہ تک کا تسلسل امت مسلمہ کی تاسیس، اس کے نظام شریعت اور اہل کتاب کے ساتھ تعلق کے مراحل کا مسلسل بیان ہے، جس کا آخری نقطہ المائدہ میں اکمال دین کا اعلان ہے۔

ایک اور مثال اصلاحی کا سورۃ التوبہ کا تجزیہ ہے جس کے آغاز میں بسملہ نہ آنے کو بھی انہوں نے نظم سے جوڑا کہ یہ سورت دراصل سورۃ الانفال کی تکمیل و تتمہ ہے، لہٰذا نئی سورت کا مستقل افتتاح مقصود نہیں۔ اسی طرح انہوں نے سورۃ الکوثر کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ابتر کے طعنے کا جواب قرار دیتے ہوئے اسے اس کے سیاق یعنی اعداء کے خاتمے اور داعی کی کامیابی کے اعلان سے جوڑا ہے۔ ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اصلاحی کا نظم محض سورتوں کی فہرست کا ربط نہیں بلکہ ہر چھوٹی بڑی فنی خصوصیت کو مفہوم کی خدمت میں لانے کی کوشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر میں ترجمہ آیات بھی نظم کے مطابق کیا گیا ہے اور حاشیوں میں ہر سورت کی ابتداء میں اس کا عمود و ربط بیان کیا گیا ہے۔

نقطۂ نظر کی اہمیت و جائزہ

اصلاحی کے نقطۂ نظر کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے قرآن کے مطالعے کو ایک نئی جہت دی: اب قرآن کو بکھرے ہوئے احکام و واقعات کا مجموعہ سمجھنے کے بجائے ایک نامیاتی وحدت کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ اس اصول سے کئی تفسیری گتھیاں سلجھیں، آیات کے مفاہیم میں سیاق کی پابندی پیدا ہوئی اور کئی ایسی آیات جنہیں منسوخ قرار دے دیا گیا تھا، نظم کی روشنی میں اپنے محل پر محکم ثابت ہوئیں؛ اصلاحی اسی بنا پر نسخ کے دائرے کو بھی بہت محدود مانتے ہیں۔ ان کے اس نظام کو علمی حلقوں میں سراہا بھی گیا اور اس کے بعض جزئی نتائج پر تنقید بھی ہوئی ہے، جو ہر بڑے تحقیقی کام کا مقدر ہوتا ہے۔

تاہم تنقید کے باوجود اس بات سے انکار مشکل ہے کہ اصلاحی نے فراہی کے اصولوں کو مکمل قرآن پر لاگو کر کے جو منظم تصویر پیش کی، اس نے اردو و عربی تفسیر کو متاثر کیا اور جدید مفسرین کے لیے نظم کو ایک لازم موضوع بنا دیا۔ ان کے یہاں نظم قرآن کا عقلی و ذوقی مطالعہ پرستش کے جذبے کے ساتھ وابستہ ہے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ ربط خود قرآن کی صداقت و اعجاز کی دلیل ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ امین احسن اصلاحی کے نقطۂ نظر کے تین ستون ہیں: ہر سورت کا عمود، سورتوں کے تکمیلی ازواج، اور پورے قرآن کے سات گروہ جن میں مکی و مدنی ادوار ایک نظم سے دہرائے گئے ہیں۔ مثالوں سے واضح ہوا کہ سورۃ یوسف و کہف کے عمود، الفیل و قریش اور

الضحیٰ والانشراح کے ازواج، اور الفاتحہ کی تمہیدی حیثیت اس نظریے کی عملی صورتیں ہیں۔ یہ نقطۂ نظر طالب علم کو یہ سبق دیتا ہے کہ قرآن

کی ہر آیت و سورت اپنے مقام پر حکمت کے ساتھ واقع ہے، اور اسے اس کے سیاق و نظم میں پڑھنا ہی اصل تدبر قرآن ہے۔

USMAN NOTES
www.usmannotes.com